ذکاءالرحمن: جدید اُردو افسانے کی کم شنیدہ آواز

نسیم اختر، پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اردو، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان

ڈاکٹر محمد خاور نوازش، ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان

ABSTRACT:

Zaka-ur-Rahman (1942-2016) belonged to Bahawalnagar district of South Punjab. He started writing fiction during his stay at Lahore. He is a very reliable reference in modern and new Urdu short story, but surprisingly he has not been cited very much. Zaka-ur-Rahman is among those short story writers of Urdu who made unique experiments at the level of style. His early short stories reflect the indigenous life of South Punjab and particularly Bahawalpur and Bahawalnagar, while later he also experimented with abstract short story and gave those a new creative style by studying religion, history, Indian mythology and philosophy. . In this paper, the thematic and stylistic study of Zakaur Rahman's short stories is presented in the light of primary and secondary sources.

پاکستان میں جدیدیت کے علم بردار جن افسانہ نگاروں نے افسانے کے کینوس کو وسیع کیا ان میں انتظار حسین، انور سجاد، خالدہ حسین، رشید امجد، منشا یاد، احمد جاوید اور مرزا اطہر بیگ کے علاوہ ذکاءالرحمن (۱) کا نام جتنا اہم ہے حیرت انگیز طور پر اتنا ہی کم مذکور اور کم شنیدہ رہا۔ ان کے افسانے ایک نئے اور اُچھوتے افسانوی اسلوب کی بنا پر انفرادی حیثیت کے حامل ہیں۔ ذکاءالرحمن کا بحیثیت جدید افسانہ نگار کمال ہی یہ ہے کہ انھوں نے روایتی افسانوی اسلوب سے انحراف کیا۔ نئی اصطلاحات اور لفظیات ایجاد کیں۔ استعاروں اور علامات کے ذریعے مشکل اور ان کہے خیالات، کیفیات اور احساسات کو افسانے کے قالب میں ڈھالا اور اپنے وسیع مطالعہ کو استعمال ہیں لاتے ہوئے انسانی نفسیات کے متعدد دریچوں کو وا کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے ذاتی تجربات اور مشاہدات کو باطنی نقطہ نظر کے حوالے سے جداگانہ انداز میں تحریر کیا۔

ذکاءالرحمن کی پچاس سالہ فنی و ادبی زندگی پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے چھ سال کی عمر میں لکھنا شروع کیا۔ ان کی پہلی کہانی یوسف دہلوی کے رسالے ''کھلونا'' میں شائع ہوئی۔ سکول کے

زمانے میں عطاءالحق قاسمی اور ناصر زیدی آپ کے ہم جماعت تھے۔تینوں دوستوں میں مشترک قدرادب سے لگاؤ تھی۔اُس صحبت نے اردو فکشن کے مطالعے کے ذوق میں اضافہ کیا۔انھیں اپنے کالج اساتذہ کے زیر اثر فلسفہ سے دلچسپی پیدا ہوئی تو دنیا کے اہم فلاسفر کا مطالعہ کیا۔روسی، چینی،ہندی اور دیومالائی تہذیبوں کے فلسفیانہ افکار کے اثرات نے ذکاالرحمن کے قلب و نظر میں وسعت پیدا کی ۔یہی اثرات بعد ازاں اُن کی کہانیوں کی تخلیقی توانائی بنے۔

ذکاءالرحمن کے افسانے اُن کی شخصیت کے آئینہ دار ہیں۔انھوں نے اپنے فن پاروں کو دل آویز بنانے کے لئے تخیل کی رنگینیوں سے بھی استفادہ کیا۔اُن کے ہاں ادبی تخلیق کا سبب واقعات نہیں بلکہ اُن کے نزدیک تخلیقی عمل اتنا پراسرار اور پیچیدہ ہے کہ اس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔کوئی احساس ، کیفیت یا جملہ انھیں لکھنے کی ترغیب دیتا ہے اور وہ اس کے زیر اثر افسانہ لکھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اُن کے پہلے افسانوی مجموعہ "درد آئے گا دبے پاؤں" سے آخری مجموعے "ذات کے اندر" کے اکثر افسانوں میں ذکا الرحمن کی کہانی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آتی ۔ افسانوی مجموعہ "میں اور زمین" اور "خواب سنگین" کے افسانوں کی بنت میں واقعہ کی بجائے کسی خیال، احساس یا کیفیت کو اہمیت دی گئی ہے۔ پہلے مجموعے کے افسانوں میں کہانی پن موجود ہے۔یہ روایتی کہانیاں ہیں جو زیادہ تر جنوبی پنجاب کے صحراؤں، زمینوں اور شہروں کے رسم و رواج کے پس منظر میں لکھی گئی ہیں۔ذکاءالرحمن کو بہاول پور، بہاول نگر، ہارون آباد اور صحرائے مروٹ سے محبت نہیں عشق ہے اس لئے وہ اپنے اس افسانوی مجموعے میں قاری کو ایک سیاح کی بجائے عاشق کی نظر سے اس علاقے کی سیر کراتے دکھائی دیتے ہیں۔ ہارون آباد کے بارے اپنے متذکرہ مجموعے کے آخری صفحے پر لکھتے ہیں:

> "ہارون آباد میں۔۔۔۔کہ ایک شہر ہے نے الوں کا۔۔۔۔پروان چڑھا۔زندگی مختصر کی جو صبحیں ،شامیں اور ساعتیں اسد یار میں گزریں،ان کو سرمایا سمجھ کر سینے سے لگائے پھرتا ہوں۔"(۲)

اپنے علاقے سے یہ محبت، یہ والہانہ پن ان کے افسانوں میں پوری طرح موجود ہے۔ جنوبی پنجاب کے علاقوں کی تہذیب و ثقافت کی صحیح معنوں میں جو عکاسی ذکاءالرحمن نے کی ہے وہ دیگر افسانہ نگاروں کے ہاں خال خال ہی ملتی ہے۔انھوں نے صحرا کی زندگی، لوگوں کے طرز بودو باش ،طرز فکراور نفسی کیفیات کو فنی

چابکدستی سے بیان کیا۔ "درد آئے گا دبے پاؤں" کے بارے اظہار خیال کرتے ہوئے ذکاءالرحمن نے خود کہا:

"میرا پہلا مجموعہ "درد آئے گا دبے پاؤں" اس بات کا ثبوت ہے کہ میں نے روایتی کہانی روایتی زبان میں لکھی ہے اور میں لکھتا ہوں، "ذات کے اندر" دیکھ لیں۔" (۳)

آبائی علاقے ہارون آباد سے لاہور منتقل ہونے کے بعد ذکاءالرحمن "حلقہ ارباب ذوق" کے اجلاسوں میں شریک ہونے لگے۔ ناصر کاظمی، ناصر زیدی، منیر نیازی، سرمد صہبائی اور اشفاق احمد سے مراسم بڑھے تو فکر و نظر کے نئے دریچے وا ہونے لگے۔ اس ادبی ماحول نے ان کے نقطہ نظر میں واضح تبدیلی پیدا کی اور وہ ان ادیبوں کی صف میں آ کھڑے ہوئے جو جدیدیت سے متاثر تھے۔ جدید ادب اور ادیب کے بارے ان کا اپنا ایک نظریہ تھا جس کا اظہار انھوں نے "ادبِ لطیف" کے ۱۹۶۴ء میں چھپنے والے اداریوں میں کیا۔ ان کے خیال میں بیسویں صدی کی بے پناہ سائنسی ترقی نے انسانی شعور کو گمنامی اور بے عزتی کے خوف میں مبتلا کر دیا۔ اس نے ایک ایسی تہذیب کو جنم دیا جس کا بنیادی فلسفہ یہ تھا کہ وقت کو انسانی خواہشات کا زر خرید غلام بنایا جا سکتا ہے۔ یوں نئی تہذیب نے انسان سے زندگی کے مقاصد چھین لیے۔ مزید یہ کہ اس تہذیب نے انسان کو ہجوم میں تنہا کر دیا اور یہی تنہائی نئے ادیب کے وجود کا سبب بنی۔ ذکاءالرحمن لکھتے ہیں:

"اگر بیسویں صدی کے انسان کا مقدر یہی ہے کہ وہ آغازِ بلوغت سے لے کر انجامِ ہستی تک موت کے خوف کی چھتری اپنے سر پر تانے رکھے تو پھر زندگی کرنے کی ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے۔۔۔اپنے وجود کو معاشرے سے علیحدہ کر لیا جائے۔ روایات اور جڑوں کے بغیر زندہ رہا جائے۔" (۴)

ذکاءالرحمن کے نزدیک نیا ادیب وہ ہے جو استحصالی معاشرے میں اپنی انفرادیت کو قائم رکھنے کی جرأت کرے۔ اس کا الہام ایک باقاعدہ اور عملی فلسفۂ حیات کی شکل میں اس کے ادب میں ظاہر ہو۔ وہ مذہب کا انکاری نہ ہو کیوں کہ ہر اعلیٰ ادب کے پس منظر میں آپ کو مذہب ہی کارفرما نظر آئے گا۔ بالفاظِ دیگر ذکاءالرحمن نئے ادیب کو صوفی کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"یہ قطعی غلط ہے کہ نیا ادیب مذہب کا منکر ہے۔ میرے خیال میں تو ایک سچے نئے ادیب کے لئے مذہبی ہونا ضروری ہے کہ فلسفۂ حیات کے ڈانڈے بالآخر مذہب سے

جا ملتے ہیں لیکن اس کا مذہب مولانا سید ابو الاعلیٰ کا مذہب نہیں ہے بلکہ ایک سچے صوفی کا مذہب ہے۔ گویا نیا ادیب ،بنیادی طور پر صوفی ہے۔"(۵)

ذکاءالرحمن کے مطابق اس نئے ادیب کے صوفیانہ رویے کی وجہ یہ ہے کہ دہر یہ اپنی زندگی کی تمام تر مشکلات کے باوجود موت کا خواہش مند نہیں جب کہ صوفی کے لئے موت زندگی کا ایک پڑاؤ ہے ۔اس لئے موت کے اندر چھپے ہوئے امکانات اسے موت سے بے خوف کر دیتے ہیں،اور یہی رویہ جدیدیت پسند ادیب کا بھی ہونا چاہیے کہ وہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زندگی کے معاملات طے کرے اور استحصالی معاشرے میں اپنے وجود کو برقرار رکھے۔

ذکاءالرحمن ایک وسیع المطالعہ شخص تھے۔اردو ادب کے علاوہ دنیا کی دیگر زبانوں کے اعلیٰ ادب پر ان کی گہری نظر تھی۔ان کے خیال میں ہر بڑا ادیب اپنے فن پاروں میں معاشرے کے لئے نیا فلسفہ پیش کرتا ہے اور اس نئے فلسفہ کی پیش کش کے لئے اسے نئی زبان تخلیق کرنا پڑتی ہے۔یہ نئی زبان مروجہ لسانی ڈھانچوں کو توڑ کر وضع کی جاتی ہے۔صنعتی اور مشینی انقلاب نے جہاں زندگی کی چال ڈھال کو بدلا وہاں اس نے لوگوں کی روزمرہ زبان میں بھی کافی تبدیلیاں کیں۔اس بدلتے ہوئے ماحول میں ذکاءالرحمن کا جدید ادیب سے تقاضا یہ ہے کہ وہ بدلی ہوئی زبان کے محاورے سیکھے۔وہ لکھتے ہیں:

"ایسے نئے محاورے ایجاد کئے جائیں،جو زمانے کی آواز کو معنی عطا کر سکیں،مشین اور رفتار کی اس دنیا کے آہنگ کا ساتھ دے سکیں،اور اس دکھی انسانیت کی نمائندگی کر سکیں جو پرانی معاشرتی وراثت کے قید خانے میں کراہ رہی ہے۔"(۶)

ذکاءالرحمن اس بات کے قائل ہیں کہ ادیب کو داخل سے خارج کا سفر کرنا چاہیے۔جب اندر کی دنیا صفحہ قرطاس پر ابھرے گی تو اس کا رشتہ خارجی دنیا سے خود بخود قائم ہو جائے گا کیوں کہ ادیب کا باطن اس کے خارج سے ہی تشکیل پاتا ہے۔باطنی دنیا کا جب خارجی دنیا سے رشتہ قائم ہو جاتا ہے تو ادب کا وژن بن جاتا ہے۔گویا انفرادی دکھ اجتماعی دکھ بن کر ابھرتا ہے۔

ذکاءالرحمن کے نزدیک ادبی روایات جدید زندگی کی تشریح سے قاصر ہیں۔جدیدیت کے علم بردار ادیبوں سے وہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ ماضی کی روایتوں کا سہارا لیے بغیر جدید مادی دنیا کے مختلف امیجز کی تشریح کرے۔ذکاءالرحمن کو اس بات کا ادراک تھا کہ نئے ادیبوں نے جب زبان کے روایتی سانچوں کو توڑ کر اپنی نثر یا شاعری میں نئی زبان استعمال کی تو اس پر ابہام کے الزامات بھی لگے اور اظہار اور

ابلاغ کے نا قابلِ فہم ہونے کا طعنہ سہنا پڑا۔ یہاں تک کہا گیا کہ "لکھے موسا پڑھے خود آ"۔ اس ضمن میں ذکا ءالرحمن کا خیال ہے :

"فنکار، "ابلاغ" کے لئے نہیں "اظہار" کے لئے کہتا اور لکھتا ہے۔ یہ امید رکھنا کہ کوئی افسانہ، کوئی نظم، کوئی غزل، کوئی تصویر تخلیق پاتے ہی قاری کے ذہن کا جزو بن جائے گی، جہالت کی بات ہے۔ اس کے لئے ایک فن پارے کو بہت طویل، جاں گسل اور کٹھن سفر طے کرنا پڑتا ہے۔"(۷)

"جدید ادب کا ابہام ایک تدریجی اور فطری نشوونما کا نتیجہ ہے۔۔۔ ایک عبقری ذہن کے مطالب ہمیشہ اس سے زیادہ ہوتے ہیں جو کچھ کہ وہ کہتا ہے اور وہ اس سے زیادہ کہتا ہے جو کچھ اس کے مطالب ہوتے ہیں۔"(۸)

ذکاءالرحمن کے مطابق کہ ادب صرف اُن منتخب افراد تک اپنا پیغام پہنچا پاتا ہے جو اپنے اپنے حلقوں میں صاحب الرائے شمار ہوتے ہیں یعنی عام قاری اول تو اعلیٰ ادب پڑھتا نہیں اور اگر پڑھ بھی لے تو چونکہ اس نے ادب کو سمجھنے کے لئے محنت نہیں کی ہوتی، نہ اس کا ذخیرۂ الفاظ وسیع ہوتا ہے، نہ اُسے یہ پتہ ہوتا ہے کہ تشبیہ، علامت، کنایہ اور تلمیح وغیرہ کیا ہوتی ہیں، تجربہ کسے کہتے ہیں، معنویت کہاں ختم ہوتی ہے اور مہملیت کہاں سے شروع ہوتی ہے،اس لیے یہ کہنا کہ کسی تحریر کا ابلاغ مشکل ہے، ادیب کے ساتھ نا انصافی ہے۔ ذکاءالرحمن کے نزدیک کسی تحریر کا مشکل ہونا عیب نہیں یہ قاری کی کم فہمی یا کم عقلی ہے جو ابلاغ کے مسائل پیدا کرتی ہے۔ بقول ذکاءالرحمن :

"خود بخود کوئی تحریر سمجھ نہیں آتی، محنت کرنا پڑتی ہے۔ آسانی سے سمجھ تو ہیر وارث بھی سمجھ نہیں آتی جو مادری زبان میں ہے۔"(۹)

اِبلاغ کا تعلق قاری کے مطالعہ اور فہم سے ہے۔ ذکاءالرحمن کو اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ افسانہ نگاری جان جوکھوں کا کام ہے۔ ہر ادیب علامتی اور تجریدی افسانے نہیں لکھ سکتا۔ علامتی اور تجریدی افسانہ لکھنے کے لئے زبان دان ہونا لازمی ہے۔ اس کے علاوہ ادیب کے لاشعور میں گہرا مطالعہ، مشاہدہ اور تجزیہ کی صلاحیت کا ہونا ازبس ضروری ہے ورنہ کہانیوں میں تکرار کا پہلو نمایاں ہونا شروع ہو جاتا ہے اور موضوعات کا دائرہ سکڑنے لگتا ہے۔ ذکاءالرحمن نے افسانہ نگاری کا آغاز روایتی کہانیوں سے کیا۔ ان افسانوں میں انھوں نے روایتی بیانیہ اسلوب اپنائے۔ جنوبی پنجاب کی تہذیب و ثقافت، طرزِ فکر اور اندازِ معاش کو

اپنے افسانوں میں یوں سمویا کہ قارئین کے علاوہ ناقدین بھی ان کے افسانوں کی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکے۔ڈاکٹر انوار احمد لکھتے ہیں:

"ذکاءالرحمن نے اردو افسانے میں پہلی مرتبہ صحرائی پنجاب کی روح اتارنے کی کوشش کی ہے۔یہ صحرائی ثقافت اجڑ ، یا نیم متمدن باشندوں کی بے ریا روحوں کی فطرت کے مکالمے کے نتیجے میں چولستان کے ذرے ذرے ہیںآباد دکھائی دیتی ہے۔۔۔ذکا ءبہاول نگر ،ہارون آباد ، ستلج، بہاول پور اور لمے کے علاقے کا ذکر کسی ہمدرد سیاح کی طرح نہیں ،عاشق کی طرح کرتا ہے اور یوں وہ علاقہ جو اب تک اردو افسانے میں منعکس نہ ہو سکا تھا،ذکا کے ذریعے اپنے اسرار منکشف کرتا ہے۔"(۱۰)

"میں اور زمین"،"خوابِ سنگین"اور"ذات کے اندر"ذکاءالرحمن کے وہ افسانوی مجموعے ہیں کہ جن میں انھوں نے روایتی کہانی سے ہٹ کر جدید افسانے لکھے ان میں علامتی افسانے ہیں اور تجریدی بھی۔موضوعات کے اعتبار سے اگر ان کے افسانوں کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں ان کے موضوعات میں تنوع دکھائی دیتا ہے۔کئی افسانوں کا موضوع خود ان کی ذات ، حالات زندگی ، نظریات اور ذاتی تجربات ہیں جیسے "اکو الف"میں انھوں نے جدید تحریر "لکھت" کے لیے ضابطۂ اخلاق مرتب کیا ہے ۔ ذکاءالرحمن کا"لکھت" سے مطالبہ ہے کہ جب کسی دین کے علماء کو پابند سلاسل کر دیا جائے تو لکھت کو چاہیے کہ وہ ان علماء کا کام اپنے ذمے لے لے ۔ جب ملک کا نظامِ اخلاق تباہ و برباد ہو جائے تو لکھاریوں کو اس کے اچھے کے لئے کام کرنا چاہیے۔لکھت کے لئے ضروری ہے کہ وہ ریاضی دانوں اور شاعروں کی حدود کو مٹا دے اور دونوں طبقے معاشرے کی بہتری کے لئے مل جل کر فکری نظام کی بنیاد ڈالیں۔اس مشینی دور نے بچوں سے ان کی معصومیت چھین لی ہے۔لکھت کو چاہئے کہ وہ ان کا بچپن لوٹا دے یعنی بچوں کے بارے کہانیاں بنے ۔معاشرے میں بڑھتی ہوئی بے چینی اور اضطراب کے خاتمے کے لئے جتن کرے،مظلوم کا ساتھ دے اور ظالم کو بے نقاب کرے۔تحریروں کے ذریعے بے ایمان تاجروں کو بے نقاب کیا جائے۔لکھاری کو مظلوم و مفلس کا وفادار ساتھی ہونا چاہیے۔ذکاءالرحمن کے نزدیک سچی لکھت ، لکھاری کا وجدان ہے جو اسے اللہ نے عطا کیا ہے اس لئے جب تک لکھاری سچائیاں لوگوں کے سامنے لاتا رہے گا تب تک انسانیت معالجاتی نفسی ماہرین کی علاج گاہوں کے پنجروں سے آزاد رہے گی۔بغور دیکھا جائے تو ذکاءالرحمن نے اس افسانے میں

"لکھت" کے پیرا میٹر ز مقرر کر دیئے ہیں اور ان کے نزدیک جو "لکھت" اس نئی تہذیب میں ان پیرا میٹر ز کو پورا کرے گی وہی لکھتوں کے ہجوم میں اپنی انفرادی شناخت بنانے میں کامیاب ہو سکے گی۔

"فاتحہ الکتاب" میں وہ اس بات کا پرچار کرتے نظر آتے ہیں کہ جدید ادب نے روایت پسند ادیبوں کو چاروں شانے چت کر دیا ہے۔اگرچہ جدید ادب تخلیق کرنے والے کم ہیں لیکن پھر بھی روایت پسند ادیبوں کی اکثریت ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔"اپنے اسم کی چشم دید گواہی" میں ذکاءالرحمٰن نے عامیانہ قصہ لکھنے والے ادیبوں کو گنتی کار یا منشی کا نام دیا ہے۔ان کے مطابق ایک لکھت کار پر الفاظ ایک معصوم بچے کی مسکراہٹ کی طرح غالب ہوتے ہیں اور انھیں اسی سچائی اور معصومیت کے ساتھ کاغذ پر منتقل کر دیتا ہے۔اس کے برعکس عام افسانہ نگار عام قصے کہانیوں کے ذریعے لوگوں کو سچ کی راہ سے بھٹکاتے ہیں۔انھیں اس بات کا یقین ہے کہ :

> "سچ کے الہام مجھ پر ہی اتریں گے ،اپنا اسم لفظ میں ہی بولوں گا اور میرے اسم کی گیارہ ہزار روشنیاں میرے باطن میں ہی سمائیں گی۔"(۱۱)

"جاننے والے کے لئے ایک کہانی" میں بھی ذکاءالرحمن نے جدید ادیب کے حوالے سے لکھا ہے کہ "مبارک ہیں ہم کہ ہمیں پتھروں کو گویا کرنے کا فرض سونپا گیا۔افسانہ "تکلیمیہ" میں ذکاءالرحمٰن نے جدید ادیب کی ایجاد کردہ نئی زبان کا دفاع کیا ہے۔ان کے مطابق نئے ادیبوں کے لئے ادب کی تخلیق کا بنیادی مقصد حقیقتِ علوی کو آسان اور عام کرنا ہے اور یہ حقیقت مروجہ زبان میں بیان نہیں کی جا سکتی۔اس کے لئے نئی زبان اور نئی اصطلاحات ایجاد کرنا ہوں گی جو ایک مشکل اور محنت طلب کام ہے۔

ذکاءالرحمن کے مطابق جدید ادبا اسی مشکل راہ کے مسافر ہیں جو بھیڑ سے الگ ہو کر اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہیں۔ذکاءالرحمن نے دنیا کے مختلف مذاہب کا گہرا مطالعہ کیا اور نتیجتاً صدقِ دل سے دینِ اسلام کی طرف راغب ہو گئے۔اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے اکثر افسانوں کا موضوع مذہب ہی ہے ۔اگرچہ مذہب پس منظر کے طور آیا ہے اس کی وجہ ان کا یہ یقین ہے کہ :

> "ہر بڑے ادب کے پیچھے مذہب کھڑا ہے ۔دستو وسکی کا ایڈیٹ کیا؟ پورا آرتھو ڈوکس چرچ اس کے پیچھے ہے۔ملٹن کی پیراڈائز، ہومر کی اوڈیسی،رومی کی مثنوی،کالی داس کی شکنتلاجاتک کتھائیں،ہزاروں سال سے زندہ چینی کہانیاں،جاپانی کہانیاں۔"(۱۲)

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے افسانوں میں انسانی مسائل کا واحد حل مذہب کی طرف مراجعت ہے۔اپنی بات کی دلیل میں وہ اپنے افسانوں میں قرآنی حوالوں سے بھی کام لیتے ہیں،اور احادیث سے بھی استفادہ کرتے ہیں جیسے افسانہ "اپنے اسم کی چشم دید گواہی" کا آغاز سورۃالفیل کے ترجمہ سے کیا گیا ہے۔مزید برآں افسانہ "پراگندہ بال اور غبار آلودہ اور دروازوں سے ہنکائے ہوئے لوگ" کی بنیاد و عنوان اس حدیث شریف پر رکھا گیا ہے کہ بہت پراگندہ بال ،غبار آلودہ،دروازوں سے ہنکائے ہوئے اگر قسم کھا جاویں اللہ پر تو بلاشبہ اللہ سچا کردے ان کو،ان کی قسم میں۔غرض ےہ کہ ان کے اکثر افسانوں کی بنت میں مذہب کا عمل دخل ہے۔ان افسانوں کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ مذہب اسلام ذکاءالرحمن کی رگوں میں خون بن کر دوڑ رہا ہے۔ان کے افسانوں کے چند عنوانات ملاحظہ کیجیے۔اصحابِ کہف،احسنِ تقویم،ن و القلم،ارضِ موعود،شرک،فاتحہ الکتاب وغیرہ۔یہ عنوانات ان کی مذہبِ اسلام سے گہری وابستگی کا بین ثبوت ہیں۔

مشرقی زبان وادب میں تصوف کو خاص اہمیت حاصل ہے۔تصوف نے نہ صرف شاعری پر گہرے اثرات مرتب کئے نثری زبان و ادب میں بھی تصوف کو ایک بڑے موضوع کے طور پر اپنایا گیا۔ذکاءالرحمن کے افسانوں کا تصوف ہی ہے۔شرک، تہہ خانہ،پراگندہ بال اور غبار آلودہ اور دروازوں سے ہنکائے ہوئے لوگ، جیسے افسانوں میں توانھوں نے غوث،قطب وابدال کی ساری حرار کی بیان کردی ہے۔شاید اس لئے "خوابِ سنگین" کے دیباچے میں انور سجاد یہ لکھنے پر مجبور ہوئے کہ "اس کا مزاج بھی سرمستی اور درویشی سے سرشار ہے اس لئے غالباًاس کے اندازِ تخاطب سے الہامی سی خوشبو آتی ہے"۔بلاشبہ وہ اپنے اکثر افسانوں میں صوفی دکھائی پڑتے ہیں۔

"میری کھلی آنکھوں کے دکھ" میں ذکاءالرحمن نے مابعد الطبیعاتی اور فلسفیانہ مسائل کو بیان کیا ہے۔گوتم بدھ کے حوالے سے "پیدائش کے دکھ" کے فلسفہ نے انسان کو جس مایوسی و ناامیدی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈبو دیا تھا،اسلام کے فلسفۂ احسان (جسے ذکاءالرحمن نے "کھلی آنکھوں کے دکھ" سے موسوم کیا ہے)نے انسان کو قلبی طور پر شاداں و فرحاں کردیا ہے۔"ن والقلم" ذکاءالرحمٰن کا تجریدی اسلوب میں لکھا افسانہ اس لحاظ سے بے مثال ہے کہ یہ جدید افسانوں میں سب سے پہلا نعتیہ افسانہ ہے جس میں حضور کی بعثت کا بیان انتہائی موثر پیرائے میں کیا گیا ہے۔حضرت جبرائیل کی تعریف جن الفاظ میں کی گئی ہے وہ مناظری اسلوب کی عمدہ مثال ہے۔حضرت جبرائیل ہی وہ پہلی ہستی ہیں کہ جنھوں نے حضورِاکرم سے اللہ

کا با قاعدہ پہلا تعارف کروایا۔ یہ تعارف ذکاءالرحمن کے عمدہ شعری ذوق کا مظہر ہے۔ نثر ایسی با کمال کہ شعر کا گماں گزرے اور پڑھتے ہوئے ایک کے بعد دوسرا لفظ ایسی روانی سے آئے کہ قاری جھوم اٹھے اور بے اختیار واہ واہ کرنے لگے۔

دیگر جدیدیت پسند افسانہ نگاروں کی طرح ذکاءالرحمن بھی اپنے افسانوں میں عام لوگوں کے معاشرتی، معاشی اور نفسیاتی و جنسی مسائل کو زیرِ بحث لائے ہیں۔ جنسی حوالے سے ان کے اہم افسانے "ایک جذبہ شعلہ نما"، "اکیلی" اور "سرخ جھنڈی" ہیں۔ان افسانوں کے مطالعے سے ذکاءالرحمن کی جنسی نفسیات سے آگاہی کا پتہ چلتا ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں بے پرواہی سے جنسی اعضا کے نام لیتے ہیں۔ جملوں کی بنت میں ان اعضاءکے نام نہ صرف کسی احتیاط کے بغیر شامل کر دیتے ہیں بلکہ ان اعضا پر ہونے والے ستم کا جس بے باکی سے اظہار کرتے ہیں وہ انھیں بقول ڈاکٹر انوار احمد "سادیت پسند نہیں تو کلبیت پسند" ضرور ثابت کرتے ہیں:

> "وہ خوشی سے جھوم اٹھا۔اس نے جھپٹ کر شیداں کو اپنی آغوش میں بھینچ لیا اور اِسے اتنا چوما، اتنا چوما کہ اس کے رخساروں اور ہونٹوں پر نیل پڑ گئے اور اس کی آنکھوں میں خمار ناچنے لگا۔"(۱۳)

علامتیت اور تجریدیت جدید افسانہ نگاری کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ذکاءالرحمن نے دیگر جدید افسانہ نگاروں کی طرح علامتیت اور تجریدیت جیسے فنی حیلوں سے خوب کام لیا۔انھوں نے عام چیزوں کو علامت کے طور پر استعمال کیا اور خوب کہا۔اس ذیل میں ان کے افسانے "تہہ خانہ"، "اصحابِ کہف"، "ارضِ موعود"، "تکلیمیہ"، "ہاتھی بچھو" او"رمکھی" وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ "تہہ خانہ" کو انھوں نے اس دنیا کے لئے علامت کے طور پر پیش کیا۔ طرح طرح کے لوگ اس تہہ خانے میں اترے اور گم ہو گئے۔البتہ منصور حلاج نے اس دنیا سے جاتے جاتے اس راز کو دنیا پر منکشف کر دیا کہ اناالحق کے نعرے میں ہی بندے کی بقا ہے۔وجہ اس کی یہ ہے کہ انا الحق کی کیفیت میں اناالعبد غرق ہو جاتا ہے۔اصحابِ کہف کی تلمیح انھوں نے جدید ادیبوں کے لئے بڑی عمدگی سے استعمال کی ہے۔اس طرح ان کے ایک اور افسانے "تکلیمیہ" میں اشجار کو ادیبوں کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ان اشجار میں وہ اشجار زیادہ پھل پھول رہے ہیں جنھیں ہم جدید ادبا کے نام سے جانتے ہیں۔"ہاتھی بچھو" کی علامت بدلتے ہوئے معاشرے کے

معاشرتی اور نفسیاتی مسائل کے لئے استعمال ہوئی ہے۔ یہ مسائل قد میں ہاتھی جتنے بڑے اور تاثیر میں بچھو جیسے زہر ناک ہیں۔ ذکاءالرحمن کے مطابق ان مسائل کا حل مذہب کی طرف مراجعت میں ہے۔

ذکاءالرحمن نے اپنے افسانوں میں روایتی علامتوں کی بجائے نئی علامتیں متعارف کروائی ہیں اور ان الفاظ کو نئے معانی عطا کیے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے علامہ اقبال نے "خودی" اور فیض نے لفظ "قاتل" کو نئے معانی پہنائے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ذکاءالرحمن کی ایجاد کردہ علامتیں شہرتِ دوام حاصل کر پائیں گی یا نہیں، یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔

ذکاءالرحمن کا عمومی رویہ روایتی لسانی ڈھانچے سے انحراف ہے۔ اس لیے انھوں نے اپنے افسانوں میں نئی لفظیات کو وضع کرنے کی سعی کی۔ الفاظ کے روایتی معنوں کو نئے معانی عطا کیے۔ اس کے پیچھے ان کی یہ خواہش کارفرما ہے جس کا اظہار وہ اپنے افسانے "میں اور زمین" میں ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> "یہ سادہ سی لکھت میں اپنے اسلوب میں لکھا سنانا چاہتا ہوں اور عامی زبان کے تمام شعبدے اور مصنوعی صرف و نحو کے تمام اصول بھول جانا چاہتا ہوں .... میں چاہتا ہوں کہ گزرے ہوئے نبیوں کا بولنا اب قدیم اوطاق پر رکھ دیا جائے اور میرا بولنا سنا جائے۔"(۱۴)

ذکاءالرحمن نے اپنے افسانوں کے منفرد اور جداگانہ اسلوب کے لیے جنوبی پنجاب میں مقامی زبانوں کے مستعمل الفاظ اس ہنرمندی اور مہارت سے استعمال کیے کہ قاری کو اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا بلکہ قاری اس سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ ان کے افسانوں میں لوک گیت اور ماہیے بھی ملتے ہیں جو جنوبی پنجاب کی تہذیب و ثقافت کی نمائندگی بھی کرتے ہیں۔ ذکاءالرحمن کے منفرد اسلوب کی ایک اور نمایاں خصوصیت الفاظ اور جملوں کی تکرار سے لسانی حسن پیدا کرنا ہے۔ افسانہ "میری کھلی آنکھوں کے دکھ" میں انھوں نے ایک جملے میں لفظ "علم" کی تکرار کی ہے۔ یہ جملہ نصف صفحہ سے زیادہ پر مشتمل ہے۔ یہاں ذکاءالرحمن نے اردو افسانے میں طویل جملہ لکھنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ ان کے اکثر افسانے ایسے ہیں کہ جنھیں پڑھتے ہوئے قاری کہیں رکتا نہیں۔ الفاظ کا تسلسل اور ترتیب اسے انجانی سی کیفیت میں مبتلا کر دیتے ہیں اور وہ تشبیہات و استعارات کے انوکھے برتاؤ سے محظوظ ہوتا ہوا افسانے کے اختتام تک جا پہنچتا ہے۔ افسانوں میں جگہ جگہ نثری شاعری قاری کو ایک عجب طرح کی حیرانی میں مبتلا کر دیتی ہے، جیسے "دن چڑھے یا رات آئے، سورج چمکے یا بادل چھائے، موسم روئے یا موسم گائے" وغیرہ۔ اس طرح کی کئی مثالیں ان

کے افسانوں میں جا بجا بکھری پڑی ہیں۔ بعض افسانوں میں پر اسراریت کی فضا نے قاری کی توجہ کو اِدھر اُدھر بھٹکنے نہیں دیا۔ مثال کے طور پر "سورج دکھ"، "شاہراہ"، "سرد سرائے شام خزاں" وغیرہ۔

ذکاءالرحمن کے جدید افسانوں کے انجام کو سمجھنے کے لیے قاری کو اپنی تمام تر فکری اور علمی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا پڑتا ہے مگر پھر بھی الفاظ کا چناؤ اور جملوں کی ترتیب کی رنگارنگی اسے انوکھی دنیا کی سیر کرواتی ہے اور وہ دیر تک خود کو اس دنیا میں بھٹکتے ہوئے پاتا ہے۔ ان کے کچھ افسانے خود کلامی پر مبنی ہیں۔ یہ خود کلامی بقول ڈاکٹر انوار احمد: "ذکاء کا ادبی اور فکری نصب العین خود کلامی کے ذریعے پورا نہیں ہو سکتا جس میں کسی قاری کو شریک کرنے کی ترغیب کا کوئی فنی حیلہ بھی پیدا نہ کیا جائے"۔ میں اس حد تک ڈاکٹر صاحب کی رائے سے اتفاق کرتی ہوں کہ ذکاء کے افسانے واقعی عام لوگوں کے لیے نہیں بلکہ خاص علمی اشخاص کے لیے لکھے گئے ہیں۔ ذکاءالرحمن وسیع المطالعہ شخص ہی نہیں ، زبان دان بھی ہیں ۔انھیں اردو، فارسی، عربی اور انگریزی پر خاصا عبور حاصل تھا اور پنجابی ان کی مادری زبان تھی ۔کسی حد تک ہندی سے بھی شد بد تھی۔ اس لیے انھوں نے افسانوں کی بنت کے لیے جو زبان استعمال کی اس میں ان تمام زبانوں سے اا ستفادہ کیا۔ ذکاءالرحمن کے پہلے افسانوی مجموعے کا اسلوب بیانیہ ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے جدید افسانوں میں روایتی اسلوب نہیں اپنایا گیا اور نہ ہی لفظوں کو ان کے روایتی معنوں میں استعمال کرنے کا رجحان ہے۔ وہ اپنا نیا معنوی نظام متعارف کرواتے ہیں جو قارئین کے لیے کئی طرح کی مشکلات پیدا کرتا ہے لیکن ذکاءالرحمن کے لیے قاری اہم نہیں ،لکھنا اہم ہے۔ قارئین سے ان کا مطالبہ ہے کہ ان کا مطالعہ وسیع ہونا چاہیے اور انھیں ادب کی اصطلاحات سے واقف ہونا چاہیے۔ عام تحریر یا پاپولر ادب ذکاء کے لیے عارضی اثر پذیری کا امل ہوتا ہے۔ صدیوں کی اثر پذیری درکار ہے تو تحریر کا اسلوب عام قارئین کی سطح سے یقیناً بلند تر ہوگا۔ افسانہ لکھنا ایک تخلیقی عمل ہے اور یہ تخلیقیت ہر انسان میں موجود نہیں ہوتی۔ ذکاءالرحمن پیدائشی تخلیق کار ہیں اور یہ تخلیقی قوت خدا کی دین ہے جو انھیں بچپن ہی سے ودیعت کر دی گئی تھی۔ وہ خود اعتراف کرتے ہیں کہ "میں شعوری ادیب نہیں ہوں"۔ یعنی وہ ان افسانہ نگاروں میں سے ہیں جنھیں "آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں"۔ کوئی واقعہ ،جملہ یا منظر ان کی تحریر کا محرک بنتا ہے اور ان کا قلم خود بخود رواں ہو جاتا ہے۔ ذکاءالرحمن کے نزدیک لکھت اپنا ہیئت و اسلوب خود لے کر آتی ہے۔ ان کے مطابق شعوری کوشش سے کسی بھی خیال کو کسی خاص ہیئت میں ڈھالنا ناممکن ہے:

"اور کیا تم جانتے ہو کہ میرے ذہن میں ہئیت اور اسلوب کے الگ الگ خانے موجود نہیں ہیں ؟ میں ایسے کسی اسلوب اور ہئیت کو نہیں جانتا جو صرف نظم کے لیے مخصوص ہو اور جس میں صرف کہانی لکھی جا سکتی ہو اور جس پر صرف ناول پورا اترتا ہو۔ میری آشنائی صرف ایک اسلوب اور صرف ایک ہیئت سے ہے اور اس کا نام انسان ہے۔"(۱۵)

ذکاءالرحمن نے اپنی زندگی میں کئی تصورات اپنائے اور پھر ان سے کنارا کشی بھی کی اس لیے ان کے افسانوں میں فکری اور موضوعاتی تنوع بھی ہے اور اسلوب کی رنگا رنگی بھی۔ان کے ہاں اسلوبیاتی سطح پر تین طرز کے افسانے دکھائی دیتے ہیں۔ پہلا طرز حقیقت نگاری کا ہے جس کی مثالیں ان کے پہلے افسانوی مجموعے "درد آئے گا دبے پاؤں" کے اکثر افسانوں اور آخری افسانوی مجموعہ "ذات کے اندر" کے کچھ افسانوں مثلاً "اکیلی"،"ڈپٹی کمشنر"اور "بابا نورا" وغیرہ میں نظر آتی ہیں۔ ان افسانوں میں انھوں نے عاشرے کے جیتے جاگتے کرداروں کے نفسیاتی ، جنسی ،معاشی اور معاشرتی مسائل کی عکاسی کی ہے۔ ذکاءالرحمن کے افسانوں کا دوسرا طرز روایتی لسانی ڈھانچے کی تحریف سے تشکیل پاتا ہے۔ان افسانوں میں وہ جدید زندگی کی حقیقت کو ٹھوس نہیں بلکہ سیال شکل میں دیکھتے ہیں جو وقت گزرنے کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ اس قسم کے افسانوں میں "نکلیمیہ"،"ہاتھی بچھو" اور "میری کھلی آنکھوں کے دکھ" وغیرہ کو مثال کے طور پر لیا جا سکتا ہے۔ پھر اُن کے کچھ افسانے ایسے ہیں جنھیں طلسماتی حقیقت نگاری کی ذیل میں لایا جا سکتا ہے مثلاً"ٹماسا ہنسی"،"صورت گر، کن" اور "شاہراہ" وغیرہ۔"ٹماسا ہنسی" ذکاءالرحمن کا وہ افسانہ ہے جس میں طلسماتی حقیقت نگاری اور سائنس فکشن پہلو بہ پہلو ملتے ہیں۔ افسانے میں ایک عجیب و غریب دنیا تخلیق کی گئی ہے۔ مگر آگے چل کر وہ سائنس فکشن کی طرف آ جاتے ہیں اور قاری کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ دنیا سائنس دان نے جینیاتی تبدیلیوں سے پیدا کی ہے۔ ذکاءالرحمن کا ایک اور متاثر کن افسانہ "صورت گر، کن " ہے۔ یہ افسانہ بہت سے حوالوں سے قاری کے ذہن پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔ پہلا حوالہ تو کہانی کی بنت ہے کہ جس میں کردار یوں نمودار ہوتے ہیں جیسے بقول افسانہ نگار: کائنات میں کوئی نیا قدرتی مظہر۔ وسرا حوالہ ماحول کی جزئیات کی ایسی پیش کش کہ پورا منظر قاری کی آنکھوں کے سامنے بننے لگتا ہے۔ مناظر کے بیان میں ذکاءالرحمن کے ہاں طوالت پسندی موجود ہے لیکن وہ پڑھنے والے کو بے زار نہیں کرتی بلکہ اُسے منظر کا حصہ بننے میں معاونت کرتی ہے۔ تیسرا حوالہ کرداروں کے ظاہری حلیہ کا مکمل بیان ہے جو قاری

کو کرداروں سے ملنے اور سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ قاری کے لیے اجنبیت کی فضا کو معدوم کر کے واقفیت اور شناسائی کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔

ذکاءالرحمن بلا شبہ پاکستان کے جدید افسانہ نگاروں میں سے ایک اہم نام ہے۔ انھوں نے منفرد موضوعات پر جداگانہ انداز میں لکھا۔ انتظار حسین کی طرح نہ تو ہمیں ان کے ہاں اساطیری اسلوب اور ناسٹلجیائی اندازِ فکر ملتا ہے اور نہ ان کے افسانوں میں انور سجاد اور جوگندر پال کی طرح ہسپتال، بجلی کے کھمبے ، کالی سڑکیں ،رات کے منظر ، مردہ خانے اور موت کی کیفیات ملتی ہیں۔ ذکاءالرحمن کے تجریدی افسانے اپنے معاصر افسانہ نگاروں سے اس لحاظ سے پیچیدہ ہیں کہ انھیں سمجھنے کے لیے وسیع مطالعہ اور فکری کاوش کی ضرورت ہے۔ اگرچہ ان کے افسانوں کی تعداد کم ہے لیکن معیار کے اعتبار سے اس مقام پر فائز ہیں کہ انھیں جدیدیت کے رجحان کے نمائندہ افسانہ نگاروں کی صفِ اول میں لا کر کھڑا کر دیتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ ذکاءالرحمن ۲۴/دسمبر ۱۹۴۲ء کو خانیوال میں پیدا ہوئے۔اُن کے والد کا نام مظہر الرحمن شریف تھا۔اُن کا تعلق ایک زمیندار گھرانے سے تھا۔ خاندانی زمینیں ضلع بہاولنگر تحصیل ہارون آباد میں تھیں۔ذکاءالرحمن نے ثانوی درجے تک کی تعلیم تحصیل ہارون آباد سے حاصل کی۔اس کے بعد ایف۔اے اور بی۔اے لاہور کے ایم۔اے۔او کالج سے کیا۔دسمبر ۱۹۶۵ءسے جنوری ۱۹۶۷ءتک معروف ادبی جریدے "ادبِ لطیف" کے مدیر رہے۔اس کے علاوہ کراچی سے دسمبر ۱۹۷۰ءمیں ماہنامہ "نئی نسلیں" جاری کیا۔کراچی میں قیام کے دوران پی ٹی وی کے لیے ڈرامے بھی لکھے۔ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "درد آئے گا دبے پاؤں" ۱۹۶۷ءمیں شائع ہوا۔اس کے بعد "میں اور زمین" (۱۹۸۷ء)، "خوابِ سنگین" (۱۹۹۱ء)، "ذات کے اندر" (۲۰۱۰ء) اور ذکاءالرحمن کے افسانے (کلیات) ۲۰۱۱ءمیں منظر عام پر آئے۔ علاوہ ازیں دو ناول "دودِ چراغ محفل" (۱۹۶۵ء) اور "پت جھڑ کا آخری دن" (۱۹۶۸ء) بھی شائع ہوئے۔ کراچی میں تنگ دستی کے باعث ذکاءالرحمن اپنے اہل و عیال سمیت لاہور منتقل ہو گئے اور ۳ /جولائی ۲۰۱۶ء کو لاہور میں ہی ان کا انتقال ہوا۔

[مآخذ: ذکاءالرحمن کے افسانوں میں جنوبی پنجاب کی تہذیب و ثقافت، مشمولہ: "حرف و سخن"، شمارہ نمبر ۵، جلد نمبر ۳، ۲۰۲۱ء، از: مہ پارہ حسن، پنجاب یونیورسٹی، لاہور]

۲۔ ذکاءالرحمن، فلیپ: "درد آئے گا دبے پاؤں"، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، ۱۹۶۷ء

۳۔ بحوالہ، آدم شیر، "ذکاوت"، بذریعہ فیس بک پوسٹ بہ عنوان "Zaka-ur-Rehman (late)"، بتاریخ ۲۲/دسمبر ۲۰۱۶ء

۴۔ ذکاءالرحمٰن، "لہریں"، اداریہ: آج کا ادب اور ادیب، مشمولہ: "ادبِ لطیف"، لاہور، شمارہ ۱تا ۱۹۶۶، ۹ء، ص ۸

۵۔ ایضاً، ص ۱۰

۶۔ ایضاً، ص ۱۴

۷۔ ذکاءالرحمٰن، "لہریں"، اداریہ: نیا سفر ہے پرانے چراغ گل کردو، مشمولہ: "ادبِ لطیف"، لاہور، شمارہ نمبر ۶، جون ۱۹۶۶ء، ص ۹

۸۔ ایضاً، ص ۹

۹۔ بحوالہ، آدم شیر، "ذکاوت"، بذریعہ فیس بک پوسٹ بہ عنوان "Zaka-ur-Rehman (late)"، بتاریخ ۲۲/دسمبر ۲۰۱۶ء

۱۰۔ انوار احمد، "ایک صدی کا قصہ"، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۵۹۱

۱۱۔ ذکاءالرحمٰن، اپنے اسم کی چشم دید گواہی، مشمولہ: "خوابِ سنگین"، کلاسیک، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۴۶۲

۱۲۔ بحوالہ، آدم شیر، "ذکاوت"، بذریعہ فیس بک پوسٹ بہ عنوان "Zaka-ur-Rehman (late)"، بتاریخ ۲۲/دسمبر ۲۰۱۶ء

۱۳۔ ذکاءالرحمٰن، سرخ جھنڈی، مشمولہ: "درد آئے گا دبے پاؤں"، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، ۱۹۶۷ء، ص ۶۸

۱۴۔ ذکاءالرحمٰن، میں اور زمین، مشمولہ: "میں اور زمین"، کلاسیک، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۴۰۱۔ ۴۰۲

۱۵۔ ایضاً، ص ۴۰۵